دینی مدارس کے نصاب اور نظام تعلیم سے متعلق بنیادی اعتراضات کا تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر حبیب الرحمن*

Abstract

Religious education centers are nowadays under global debate in perspective of their curriculum, system of education and other activities. Western institutes including print and electronic media, research institutes and think tanks, and NGOs raising doubts and serious questions on system of education of religious educational institutes and exceptional expanse of augmentation has been seen in discussions regarding this issue in western media. These thoughts specify on the process of transforming curriculum of religious educational institutes and making them harmonious with contemporary needs. In order to achieve these intentions, it is sometimes recommended that government level initiatives should be taken and also involvement of foreign world. The factual status of these objections on the curriculum and system of education of religious educational institutes will be evaluated in this research study.

Keywords: Madaris,curriculum,system,impugn

آج دنیا میں دینی مدارس عالمی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ مغرب کے بہت سے ادارے، ذرائع ابلاغ، تحقیق کار، این جی اوز اپنے اپنے مقاصد کے تحت مدارس کے نظام تعلیم، نصاب اور دیگر سرگرمیوں کے حوالے سے سوالات اٹھا رہے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی ذرائع ابلاغ میں ان حوالوں سے گفتگو میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ بالخصوص یہ موضوع کہ مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب کو تبدیل کر کے عصری ضروریات سے کیسے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے حکومتی سطح پر

---

*- اسسٹنٹ پروفیسر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔ اسلام آباد

بھی متعدد اقدامات تجویز کیے جاتے ہیں اور بیرونی دنیا سے بھی تعاون کی پیش کش کی جاتی ہے۔ دینی مدارس کی اصلاحات کے حوالے سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اس قدر دلچسپی کیوں پائی جاتی ہے، مدارس کے موجودہ نظام اور نصاب پر جوہری زیر نوعیت کے اعتراضات کیا ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ زیر نظر مقالہ میں اس کا جائزہ لیا جائے گا۔

دینی تعلیم اور دینی اداروں سے متعلق جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے کیونکہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر دینی مدارس گفتگو کا اہم عنوان بنے ہوئے ہیں جن حلقوں کی طرف سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ا۔ مغربی میڈیا اور اہل قلم

اس طبقہ کی طرف سے تسلسل سے کہا جا رہا ہے کہ دینی مدارس دہشت گردی کے مراکز ہیں، بچوں کو اغوا کر کے زبردستی یا لالچ دے کر خودکش حملوں پر مجبور کیا جاتا ہے، ان کے القاعدہ اور عسکری تنظیموں سے روابط ہیں جو دہشت گردی کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، انہیں بعض اسلامی ممالک سے ان مقاصد کے لیے مالی امداد ملتی ہے، وغیرہ۔

۲۔ مسلم سیکولر اور لبرل طبقہ

مذکورہ بالا اعتراضات ملک کے سیکولر اور لبرل طبقہ کی طرف سے بھی کیے جاتے ہیں، تاہم اس طبقہ کی طرف سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دینی مدارس میں برداشت اور رواداری نہیں ہے، یہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہیں، یہ اقلیتوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرتے ہیں، یہ مخالفین اور غیر مسلموں کے تنازعات میں مسلح جدوجہد کی حمایت کرتے ہیں، مزید یہ کہ مدارس میں پڑھایا جانے والا نصاب تعصب، عدم برداشت اور انتہا پسندی کا ذریعہ ہے اور اس سے فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلافات پروان چڑھتے ہیں۔

۳۔ دینی طبقہ

بعض دینی حلقوں کے سنجیدہ علما کی طرف سے بھی وقتاً فوقتاً یہ کہا جاتا ہے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب میں اصلاحات کی ضرورت ہے کیونکہ مروجہ نصاب اور نظام اسلامی ریاست کی ضروریات کما حقہ پورا نہیں کرتے اور یوں اسلامی معاشرے کی تشکیل میں انہیں جو کردار ادا کرنا چاہیے اس میں تشنگی پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ تعصب، جمود، تنگ نظری، تکفیر اور مسلکی اختلافات دینی مدارس کی پہچان بن چکے ہیں۔

ان تمام اعتراضات کو نہ تو جوں کا توں تسلیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بیک جنبشِ قلم مسترد کیا جا سکتا ہے بلکہ اس نوع کے تمام سوالات کا حقائق کی روشنی میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ یہ بات نہایت اہمیت کی حامل ہے کہ اس بات کا

جائزہ لیا جائے کہ کون ساطبقہ نیک نیتی کے ساتھ مدارس کی حقیقی اصلاح چاہتا ہے اور کون ساطبقہ دینی مدارس کے کردار کو مسخ کرنے کے لیے منظم انداز میں ان کے خلاف محض پروپیگنڈہ کر رہا ہے، مزید یہ کہ ان مدارس کے کون سے پہلو قابل اصلاح اور قابل توجہ ہیں اور اس حوالے سے خود دینی مدارس کی طرف سے کیا اقدامات اب تک ہوئے ہیں اور مزید کیا مشکلات پائی جاتی ہیں۔ زیر نظر مقالہ اسی سلسلہ کے ایک تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہوگا۔

مغربی میڈیا اور قلمکاروں کی جانب سے عائد کردہ بنیادی اعتراضات

مغرب میں ایک طرف اسلام کے متعصب ناقدین بھی موجود ہیں جن کا واحد مطمع نظر مسلمانوں کی علمی روایت کی نفی کرنا اور اس کی قدر وقیمت گھٹانا ہے، جب کہ دوسری طرف نسبتاً متوازن اور ہمدردانہ نقطۂ نظر رکھنے والا طبقہ بھی ہے گو کہ وہ تعداد میں کم ہے۔

1. مذکورہ طبقہ کی طرف سے دینی مدارس پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سرفہرست درج ذیل اعتراضات ہیں: یہ الزام کہ دینی مدارس کے طلبا انتہا پسند اور دہشت گرد ہیں اور دینی مدارس ''دہشت گردی'' کے تربیتی کیمپ ہیں، مزید یہ کہ مدارس عربیہ کے طلبا مسلح اور جہادی سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور ان کے عسکری تنظیموں سے روابط ہیں۔
2. مغربی میڈیا کی طرف سے تسلسل سے یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ان طلبا کو جنت کا حسین منظر دکھا کر خودکش حملوں پر مجبور کیا جاتا ہے۔
3. یہ الزام کہ دینی مدارس میں غیر مسلموں سے مسلح تصادم (جہاد) کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے آئے دن اقلیتوں اور ان کی عبادت گاہوں پر حملے ہوتے ہیں۔
4. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مدارس میں مغرب بالخصوص امریکہ سے نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں۔
5. یہ الزام کہ ان مدارس میں غیر ملکی طلبا کی ایک بڑی تعداد زیر تعلیم ہے جو دہشت گردی کے فروغ کا ذریعہ ہے۔
6. یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ مدارس مختلف اسلامی ممالک بالخصوص عرب ممالک سے بھاری مالی امداد لیتے ہیں اور یہ مالیات دہشت گردی کی کارروائیوں میں استعمال کی جاتی ہے۔

7. یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دینی مدارس خواتین کی تعلیم کے خلاف ہیں[1] وغیرہ وغیرہ

ان اعتراضات کی حقیقت

مدارس اور دینی حلقوں کی طرف سے ان اعتراضات کا بالعموم یہ جواب دیا جاتا ہے کہ دینی مدارس سے متعلق انتہا پسندی، دہشت گردی اور مسلح تربیت کا الزام 11/9 کے بعد کی تخلیق ہے۔ اس نوع کے اعتراضات اسلام اور مسلمان دشمن عناصر کا پروپیگنڈہ ہے جس کا مقصد اپنے ظالمانہ اقدامات کی پردہ پوشی ہے۔[2]

اس پروپیگنڈہ کی حقیقت یہ ہے کہ افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت کے نتیجہ میں پوری مسلم دنیا میں جہاد اور بیداری کی لہر پیدا ہوئی بالخصوص افغانستان اور عراق میں امریکی جارحیت نے اس لہر کو تیز کر دیا مسلمانوں نے اپنی آزادی کے لیے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا۔ اگر یہ جہادی جذبہ دینی مدارس پر اثرانداز ہوا تو اچھنبے کی بات نہیں بلکہ دینی مدارس سے کہیں زیادہ عصری علوم کے مراکز یعنی کالجز اور جامعات کے طلبا نے جہاد میں حصہ لیا اور اپنے لہو کے نذرانے پیش کیے۔ اگر استعمار کے خلاف دینی مدارس اور عصری جامعات کے طلبا منظم اور متحد ہوئے ہیں تو یہ ایک فطری امر ہے۔ افغانستان میں امریکا کی قیادت میں درجنوں ریاستیں نیٹو کے پرچم تلے مسلح اور منظم کارروائیاں ہو رہی ہیں تو وہاں کے شہریوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی جان، مال، عزت و آبرو کا دفاع کریں۔ یہ دفاع ان کا قانونی اور شرعی حق ہے۔

مغربی میڈیا کے اس پروپیگنڈہ کی تہہ میں یہ خوف کارفرما ہے کہ اگر اسلامی تہذیب کو ریاستی نظام کے طور پر قدم جمانے کا موقع مل گیا تو یہ عالمی نظام اور مغربی تہذیب و ثقافت کے لیے حقیقی خطرہ بن سکتی ہے۔ گو کہ مغرب کو معاشی، سیاسی اور فوجی لحاظ سے عالم اسلام پر بالادستی حاصل ہے مگر مغربی تہذیب و ثقافت اور فلسفہ کے مقابلہ میں اگر کسی فلسفہ و ثقافت اور تہذیب و ثقافت میں کھڑا ہونے کی صلاحیت تو وہ صرف اور صرف اسلام ہے مغربی میڈیا کے زیر اثر ملکی ذرائع ابلاغ نے بھی ہاں میں ہاں ملادی ہے کیونکہ المیہ یہ ہے کہ اہل مغرب کے زاویہ ہائے نظر کا سنجیدہ علمی و تحقیقی مطالعہ کرنے اور معروضی انداز میں اس کا تجزیہ و تنقید کرنے کی روایت ارباب دانش اور اہل صحافت میں جڑ نہیں پکڑ سکتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان اہل علم خود اپنے مذہب اور اپنی ہی تاریخ و تہذیب کے حوالے سے علم و تحقیق کے میدان میں اپنا مقدمہ مؤثر انداز میں پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کا تفصیلی اور تحقیقی جواب مقالہ کے آخر میں دیا جائے گا۔

۱۔ مدارس دینیہ پر الزامات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ کیجئے: Fair Christine, c .MilianalRecruirmental Pakistan Asia Policy Number 4 July 2007 p.107-134

۲۔ خالد رحمن، پاکستان میں دینی تعلیم منظر، پس منظر و پیش منظر، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد، ۲۰۰۹

سیکولر اور لبرل طبقہ کے اعتراضات

سیکولر طبقہ کی طرف سے مدارس پر بالعموم درج ذیل اعتراضات کیے جاتے ہیں:

۔ دینی مدارس عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہیں۔

۔ مدارس کے طلبا میں برداشت اور رواداری نہیں ہے۔

۔ مدارس میں اقلیتوں اور غیر مسلموں کے خلاف نفرت وانتقام کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۔ دینی مدارس ترقی میں رکاوٹ ہیں۔ دینی مدارس میں ترقی ایک بے معنی چیز ہے۔

۔ دینی مدارس کا نصاب تعصب، جمود اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔

۔ دینی مدارس کا نصاب عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں، یہ قدیم اور فرسودہ نظام تعلیم ہے جو موجودہ دور کا ساتھ دینے سے قاصر ہے۔[3]

۔ مخالف مسلک کے لیے انتہا پسندانہ رویہ رکھتے ہیں اور مسلح جدوجہد کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

اس نوع کے متعدد اعتراضات کیے جاتے ہیں اور جو اعتراضات مغربی قلمکاروں کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں انہیں بھی دہراتے رہتے ہیں[4]

ان اعتراضات کا ایک تنقیدی جائزہ

غیر مسلم اقلیتوں کے حوالے سے اعتراضات کا جائزہ:

اس اعتراض کو دو پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے

ا۔ غیر مسلم شہریوں کے حوالے سے اسلامی فکر کا تجزیاتی مطالعہ

۲۔ غیر مسلم شہریوں کے حوالے سے دینی مدارس کا رویہ

۳۔ سیکولر لابی کے دینی مدارس پر اعتراضات کی تفصیل کے لیے دیکھئے۔ ڈاکٹر، پرویز هود بھائی، ریاست اور تعلیم: پاکستان کے پچاس سال، تالیف، ترجمہ خلیل احمد ص ۲۶۷۔۲۸۵ بقول اے ایچ نیر "مدارس کی موجودہ تعلیم ذہن کے منجمد عہد کے وجود کا پتہ دیتی ہے جب متنازعہ وجوہات کی بنا پر چند صدی پیشتر وقت ایک نقطے پر منجمد ہو گیا تھا"۔ دیکھئے: ریاست اور تعلیم، ص ۲۶۷
مزید تفصیل کے لیے دیکھئے سیکولر اور لبرل لابی کے نصاب تعلیم پر کاری وار، کاشف حفیظ صدیقی اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی ۲۰۱۱ء

۴۔ دیکھئے: محمد منیر وایم آر کیانی (مرتبین) رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات مساوات پنجاب ۱۹۵۳ء لاہور انصاف پریس ۱۹۵۳ء ص ۲۱۶۔۲۱۷

مذکورہ بالا دونوں پہلوؤں سے جائزہ لینے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ سیکولر طبقہ غیر مسلم شہریوں کے حقوق سے متعلق جدید یا قدیم اسلامی فکر سے بھی مطمئن نظر نہیں آتا اور وہ اس حوالے سے اسلامی تعلیمات کو ہی ہدف تنقید بناتا ہے۔اس لیے اس اعتراض کا اس پہلو سے بھی جائزہ لینا ضروری ہے۔جب بھی وطن عزیز میں اسلامی دستور کی تدوین کی بات کی گئی یا ریاستی اداروں کی اسلامی تشکیل کا مطالبہ کیا گیا تو ان مطالبات کی غیر مسلم اقلیتوں اور سیکولر طبقہ کی طرف سے اس بناء پر مخالفت کی گئی ہے کہ اس سے ان کے مذہبی اور شہری حقوق پامال ہوں گے۔لبرل طبقہ نے برملا ان خدشات کا اظہار کیا کہ اسلامی حکومت کا قیام پاکستان کے داخلی افتراق وانتشار کا باعث ہوگا۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں دستور ساز اسمبلی کی طرف سے قرارداد مقاصد کی منظوری کے ساتھ ہی اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت اور ان کے حقوق کے بارے میں زوردار مباحثے کا آغاز، قادیانیت مخالف تحریک (۱۹۵۳ء) پر جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔آر کیانی پر مشتمل تحقیقاتی عدالت کی طرف سے شائع کردہ رپورٹ کے بعد اس خدشہ کا اظہار کیا گیا کہ اسلامی ریاست کے قیام کی صورت میں غیر مسلموں کے ساتھ امتیازی برتاؤ ہوگا اور ان کے مذہبی حقوق پامال ہوں گے۔اس رپورٹ میں سرفہرست جو مسائل زیر بحث آئے ان میں اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کی حیثیت، غیر مسلموں کا حق تبلیغ اور ارتداد کی سزا بطور خاص ذکر ہیں[5]

پاکستان میں اقلیتوں کی نسبت سے گزشتہ چند دہائیوں سے جو مسئلہ سرفہرست رہا ہے وہ توہین رسالت کے حوالہ سے کسی غیر مسلم کو سزا دینے اور تبدیلی مذہب کے واقعات ہیں کہ اگر کوئی ہندو لڑکی مسلمان ہونے کے بعد کسی مسلمان لڑکے سے برضا ورغبت نکاح کر لیتی ہے تو اسے میڈیا میں مذہبی اقلیتوں سے "نارواسلوک" یا "امتیازی سلوک" قرار دیا جاتا ہے اور انسانی حقوق کی تنظیمیں پروپیگنڈہ شروع کر دیتی ہیں۔

اگر ان اعتراضات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے، تو یہ مسائل سیاسی اور قانونی نوعیت کے ہیں۔سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کے ذرائع ابلاغ، سیاسی جماعتیں، اقلیتیں، غیر سرکاری تنظیمیں اسے مذہبی مسئلہ کہہ کر انسانی حقوق کا شور مچاتے ہیں، تجزیہ نگار اسے ملک کی مذہبی شناخت اور مذہبی جنونیوں کا مسئلہ بنا ڈالتے ہیں اور ملک کو سیکولر ریاست قرار دینے کا مطالبہ کرتے ہیں تاکہ ریاست کی نظر میں سب برابر کے شہری قرار پائیں۔

امر واقع یہ ہے کہ قرارداد مقاصد اقلیتوں کے حقوق کی ضامن ہے۔دستور پاکستان ۱۹۷۳ء کے دوسرے حصے میں بنیادی حقوق بڑی وضاحت سے بیان کر دیے گئے ہیں۔اس فہرست میں پاکستان کے شہریوں میں کوئی ایسی تفریق نہیں

۵۔ حوالہ بالا

ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔اس طرح ملک کے جملہ وسائل اقلیتوں کو یکساں دستیاب ہیں۔ان پر کوئی قدغن مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے۔

چند ایک مثالیں

۔سینیٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتی نمایندگی کے دو طریقے ہیں۔آزاد حیثیت سے انتخابات لڑنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔مزید یہ کہ آبادی کے تناسب سے بھی نمایندگی کا راستہ موجود ہے۔اس طرح ان کی نمایندگی آبادی کے تناسب سے دوگنی ہو جاتی ہے۔

۔تعلیمی اداروں، علاج معالجے کی سہولتوں اور دیگر بنیادی ضروریات میں کہیں بھی مذہب کی بنیاد پر فرق روا نہیں رکھا گیا۔جمہوری اور اسلامی اصولوں کے مطابق اقلیتوں کو تمام تر حقوق حاصل ہیں۔

جزیہ، حقوق شہریت، مجالس قانون ساز کی رکنیت، اعلیٰ مناصب پر تقرر، عبادت گاہوں کی تعمیر، تبلیغ مذہب، عقیدہ و مذہب کی آزادی، غیر مسلموں کے مذہبی وسیاسی حقوق جیسے موضوعات پر معاصر مسلمان علم وفقہامیں بھی زبردست علمی و فکری مباحثہ ہوا ہے۔بعض ممتاز اہل قلم مثلاً سید مودودی، سید قطب، علامہ یوسف القرضاوی، راشد الغنوشی وغیرہ نے مغربی وشہری حقوق کی نئی تعبیر وتوجیہ پیش کی، جس سے اسلامی ریاست کے تصور کے ناقدین اور غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظات دور ہو سکیں۔معاصر علما غیر مسلموں کے حقوق کے لیے میثاق مدینہ کو بنیادی دستاویز کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

دوسرا حصہ: دینی مدارس کا رویہ

ان غیر مسلم شہریوں کے ساتھ دینی مدارس کی کبھی محاذ آرائی نہیں رہی ہے۔یہ لوگ نہ ایک دوسرے کے خلاف کتابیں لکھتے ہیں، نہ مناظرے کرتے ہیں اور نہ کبھی ہندو یا مسیحی ہونے کی وجہ سے ان سے مسلح تصادم ہوا ہے۔بعض مذہبی طبقات کے ساتھ کبھی کبھی تنازعات کی جو صورتیں پیدا ہو رہی ہیں ان کی بنیاد مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور سماجی ہے۔ دینی مدارس میں جو تعلیمات دی جاتی ہیں ان میں تو تمام انبیاپر ایمان اور ان کی عزت واحترام کا درس دیا جاتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ان اقلیتوں کو سیکولر ممالک میں معمولی اہمیت بھی نہیں دی جاتی لیکن یہاں میڈیا اور این جی اوز انسانی حقوق کے نام پر شور مچاتے ہیں۔بدقسمتی سے اس عہد جدید میں کمزور اور غریب ممالک طاقتور عالمی ممالک کے سامنے بے بس اور مجبور ہیں۔کروڑوں کی آبادی میں روزانہ کئی قتل ہوتے ہیں، لوٹ مار کے واقعات ہوتے ہیں لیکن ۹۸% آبادی سے متعلق خبر کو کوئی اہمیت نہیں ملتی لیکن کسی مسلمان اور غیر مسلم شہری کا کوئی تنازعہ سامنے آجائے تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔

تجزیہ

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ''سب اچھا ہے''۔ المیہ یہ ہے کہ دینی تعلیمات سے بے خبری اور جہالت مسلمانوں میں بھی عام ہے، جذباتی اور انتہا پسند عناصر کی بھی کمی نہیں اور ان کی اس جہالت اور انتہا پسندی کا نشانہ معصوم مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہی بنتے ہیں لیکن ان کا ذمہ دار ہر لحاظ سے دینی مدارس کو قرار دینا قرین انصاف نہیں ہے۔

عورتوں کی تعلیم کے خلاف ہونے کا الزام

مسلم اور مغربی تہذیب کی اپنی اپنی اقدار و روایات ہیں۔ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ مغربی خواتین کی مادر پدر آزادی کی جو روایت ہے اور لبرل طبقہ جس کا علمبردار ہے، وہ اسلام اور مسلمانوں میں نہیں ہے اور دینی مدارس میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ لیکن اسلام عورتوں کو ہر گز گھروں میں قید نہیں کرتا بلکہ اپنے تہذیبی دائرے میں جو آزادی دیتا ہے وہ خواتین کو حاصل ہے۔ اس وقت بہت سے دینی مدارس نے بچیوں کے لیے دینی تعلیم کا اہتمام کیا ہے گو کہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اس کی بڑی وجہ دینی مدارس کے مالی وسائل کی کمی ہے، لیکن خواتین کی تعلیم کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس وقت سینکڑوں بلکہ ہزاروں طالبات کے مدارس ہیں جنہیں مختلف دینی مدارس کی سرپرستی حاصل ہے یعنی مختلف مدارس کسی نہ کسی سطح پر اس کا انتظام بھی کر رہے ہیں۔

NGO's کے اس پروپیگنڈہ کا مقصد عالمی طاقتوں سے پیسہ بٹورنا ہے اور اس نوع کے سیاسی اور معاشی فوائد کا حصول ہے۔ اگر یہ طبقہ واقعتاً عورتوں کا ہمدرد ہے تو سوال یہ ہے کہ اب تک انہوں نے پروپیگنڈہ کے علاوہ عملاً کتنے ادارے خواتین کی تعلیم کے لیے بنائے ہیں؟ اسی سے ان کے مذموم عزائم کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے جتنے ادارے خواتین کی تعلیم کے لیے کام کر رہے ہیں وہ ناکافی ہیں وسائل و مشکلات سے قطع نظر اس میں بحیثیت قوم یہ ہماری غفلت کا نتیجہ بھی ہے۔

دینی مدارس پر عدم برداشت، تعصب و جمود اور نصاب کے قدیم و فرسودہ ہونے کا اعتراض

یہ وہ جوہری نوعیت کے اعتراضات ہیں جو سیکولر طبقہ کی طرف سے بھی کیے جاتے ہیں لیکن خود دینی مدارس کے سنجیدہ حلقوں میں بھی گزشتہ ڈیڑھ صدی سے موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان اعتراضات کا تفصیلی جائزہ تیسرے طبقہ کے اعتراضات کے ضمن میں لیا جائے گا۔

سنجیدہ دینی حلقوں کی طرف سے عائد کردہ اعتراضات

وہ اعتراضات جو مغرب یا سیکولر طبقہ کی طرف سے کیے جاتے ہیں ان کے خلاف دینی مدارس میں شدید رد عمل کی کیفیت دیکھنے میں آتی ہے یہی وجہ ہے کہ حکومتی سطح پر جب کبھی مدارس کی اصلاح کے نام پر کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو اسے شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسے دینی مدارس کی خود مختاری میں مداخلت گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک حکومتی سطح پر ان نوع کے اقدامات محض سعی لاحاصل ہی رہے ہیں۔ البتہ جب دینی مدارس کے بعض اکابرین کی طرف سے ''اصلاحات'' کی آواز اٹھائی جاتی ہے تو اس میں وزن محسوس کیا جاتا ہے اور اسے اہمیت بھی دی جاتی ہے۔

اصلاحات کی مزاحمت کا دور

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہی سے بعض دینی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا تھا کہ دینی مدارس کے نظام و نصاب میں اصلاحات کی ضرورت ہے لیکن اس وقت اصل مسئلہ دینی علوم کے تحفظ کا تھا، اس وجہ سے وہ کسی قسم کی اصلاح کے لیے آمادہ نہیں تھے بلکہ اس کی شدید مزاحمت کی جاتی تھی۔ مولانا یعقوبؒ (جب وہ دار العلوم دیوبند کے مہتمم تھے) سے جب یہ بات کی گئی کہ درس نظامی میں جدید علوم کو بھی شامل کیا جائے تو انہوں نے جو جواب دیا اس سے اس مزاحمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

> ''تجربہ شاہد ہے کہ جب نقد و ادھار جمع ہوں تو ہر شخص نقد کو ترجیح دیتا ہے اور ادھار پر راضی نہیں ہوتا۔ اب سمجھ لیجئے علوم دینیہ اور فکر آخرت تو مؤخر بلکہ غیر مقصود بن جائیں گے اور عصری علوم کا ادخال مفید ثابت نہیں ہوگا، بلکہ مدارس کی شکل ایک معجون مرکب تیار ہو جائے گی جس کا نتیجہ نہ وصال خدا نہ وصال صنم کی صورت میں ہوگا۔''[6]

یہی مؤقف مولانا حسین احمد مدنی کا بھی تھا۔ مولانا انظر شاہ کشمیری فرماتے ہیں کہ مولانا کے سامنے نصاب میں عصری علوم کو شامل کرنے کی بات ہوئی تو فرمایا:

> ''میرے مرنے کا انتظار کیا جائے تاکہ حضرت نانوتویؒ جب مجھ سے یہ سوال کریں کہ تم نے دار العلوم کو کس حال میں چھوڑا ہے تو یہ جواب دے دوں کہ جس حال میں آپ چھوڑ کر آئے''۔[7]

اسی طرح کا نقطہ نظر مولانا حفظ الرحمن کا بھی بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ ان کے بارے میں یہ خیال تھا کہ وہ جدید تقاضوں سے بھی واقف ہیں اور قدامت سے بھی ان کا رشتہ بڑی مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ جب نصاب کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مولانا حفظ الرحمن سنتے رہے اور پھر فرمایا:

۶۔ دیکھئے مودودی، تحقیقاتی عدالت کی رپورٹ پر تبصرہ، ادارہ معارف اسلامی، لاہور ۱۹۹۴ء۔

۷۔ خالد رحمن، دینی مدارس تبدیلی کے رجحانات، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد ۲۰۰۸، ص ۵۶۔۵۷

''بھائی تمہارے پاس یونیورسٹیاں ہیں، سکول ہیں، کالج ہیں، جگہ جگہ مدارس ہیں، آپ نصاب کے اوپر تجربے اپنے خیالات اور افکار کے مطابق وہاں کرلیں، ہمیں یہ مدرسے دے دیجئے، ہم یہاں اپنے انداز اور طریقے کے مطابق دین کی خدمت کر رہے ہیں لیکن بہر حال اس کے باوجود دو چار چیزیں ہیں۔ ایک صاحب یہ فرما رہے تھے جو قابل توجہ ہے۔ ایک مسئلہ ہے مقاصد کی حفاظت کا، یہ سمجھنا پڑے گا کہ دینی نصاب سے مقاصد کیا ہیں۔ دوسرا مسئلہ ہے کتابوں کا۔ مقاصد کی حفاظت کے بعد کتابوں کا مسئلہ کوئی اہم نہیں ہے۔ ان میں تغیر اور تبدیلی کی جا سکتی ہے۔''[8]

قدیم نظام کی افادیت کا قائل طبقہ

دینی مدارس میں یہ نقطہ نظر بہت حد تک مقبول رہا اور ایک طبقہ اب تک اس پر مطمئن ہے کہ قدیم نظام کی افادیت اب بھی اسی طرح ہے اور اس میں کسی بڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے وہ اپنے مؤقف کے حق میں درج ذیل دلائل دیتے ہیں:

دلائل

1. مدارس کے نصاب میں جمود و تعطل کبھی نہیں رہا۔ وقت اور ماحول کے لحاظ سے اس میں تدریجاً تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کتابوں میں بھی تغیر ہوا اور فنون میں بھی۔
2. درس نظامی کے قدیم نظام و نصاب کی افادیت کی ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ یہ ڈیڑھ صدی سے رائج ہے اور اسے اب بھی جو قبولیت حاصل ہے وہ کسی اور نصاب کا تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے پھر وہ اس کے مساوی ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔
3. درس نظامی کے فضلا نے یونانیوں کے علوم عقلیہ پڑھ کر مسیحی پادریوں کو دندان شکن جوابات دیے۔[9]
4. مدارس کا نصاب آج بھی اسی طرح مفید ہے لیکن یہ محنت و مشقت کا دور نہیں ہے اس لیے اسے سہل بنانے کی بات کی جاتی ہے۔[10]
5. اصلاحات کے مطالبات کو بالعموم دینی مدارس اپنی آزادی اور خود مختاری کے خلاف تصور کرتے ہیں اور اس طرح کی ہر ایسی کوشش جو حکومتی سطح پر کی جائے، اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تاہم دینی مدارس نے اصلاح

۸۔ عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم اور عصری تقاضے، نئی دہلی ۱۹۹۵ء ص ۸۲

۹۔ حوالہ بالا ص ۳۵

۱۰۔ حوالہ بالا

احوال کے لیے جو کوششیں کیں ہیں ان کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے جس سے ان اعتراض کی حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ مدارس جمود کا شکار ہیں مزید یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بعض دینی مدارس کے ارباب اختیار کے اس نقطۂ نظر کو زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہوئی جو کسی بھی طرح کے اصلاح احوال کے حق میں نہیں تھے۔

اصلاح احوال کی کاوشیں

دینی مدارس مسلمانوں کے اس تاریخی اور روایتی نظام تعلیم کا تسلسل ہیں جس سے مسلمانوں کی درخشندہ علمی روایات وابستہ ہیں۔ مدرسہ نظامیہ بغدادیہ کے قیام (۴۵۹ہجری/۱۰۶۶ء) سے قبل کی درسگاہیں مساجد کے ساتھ ہوتی تھیں، جیسے درس گاہ مسجد نبوی، مسجد صفہ، جامع عمرو بن العاص قاہرہ، جامع منصور بغداد وغیرہ۔ مدرسہ نظامیہ بغدادیہ ادارہ جاتی سطح پر قائم ہونے والی پہلی درس گاہ ہے۔[11] مصر، بغداد اور دمشق کے عظیم علمی مراکز اسی نظام تعلیم کا تسلسل تھے، جو بعد ازاں وسط ایشیا، غزنی اور خراسان کے راستہ لاہور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ اور اجمیر پہنچا۔ مولانا ابوالحسنات ندوی نے اس نظام تعلیم کے تاریخی خدوخال کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اس نظام تعلیم کے تحت اندلس کی درس گاہوں میں شریعت اور زبان کے علوم کے علاوہ کیمیا، فلکیات، ہندسہ، طب، نباتات، حیوانیات اور دیگر سائنسی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ابوالحسنات ندوی کے مطابق ہندوستان کے نصاب تعلیم کا تیسرا مرحلہ دورِ اکبری سے شروع ہوتا ہے جس میں علم طب، علم ہیئت جیسے سائنسی علوم کا بھی اضافہ کیا گیا۔[12]

نظام تعلیم کا نمایاں وصف

نظام تعلیم کی یہ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شریعت کے ساتھ ساتھ سماجی سائنسی اور لسانی علوم کا جامع امتزاج تھا اور اس سے ماہرین شریعت کے ساتھ ساتھ ماہرین فلکیات، فن تعمیرات کے ماہرین اور ریاست و معاشرے کو مطلوب دیگر رجال کار بھی پیدا ہوتے تھے۔ مسلمانوں کی عظمت اور عروج اس یکساں نظام تعلیم میں مضمر رہا ہے۔ اس بات کا اعتراف مسلمان مؤرخ ہی نہیں کرتے بلکہ ایک غیر مسلم مؤرخ اور دانش ور ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:

> ”مسلمان اس طریقہ تعلیم سے اعلیٰ قابلیت اور دنیوی تربیت بھی حاصل کرتے تھے، ہم اپنے دور حکومت کے پچھلے ۷۵ سال میں انتظام ملک کی خاطر اس طریقہ تعلیم سے مسلسل فائدہ اٹھاتے رہے، اس دوران ہم نے اپنا طریقہ تعلیم بھی رائج کرنا شروع کرایا پھر جونہی ایک نئی نسل اس نئے طریقے

۱۱۔ گیلانی، سید مناظر احسن، پاک وہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص ۱۵۳

۱۲۔ سلیم منصور خالد، دینی مدارس کا نظام تعلیم، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد ۱۹۹۳ء، ص ۲۰۵۔۲۱۱

کے تحت پیدا ہو گئی، ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیر باد کہہ دیا۔ جس سے مسلمان نوجوانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔"[13]

اصلاحات کا تسلسل

برصغیر میں جو نظام تعلیم رائج رہا ہے اس میں وقتاً فوقتاً اصلاحات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شاہ ولی اللہ محدث نے نصابی اصلاح کے لیے قابل قدر کوششیں کیں۔ انہوں نے قرآن وسنت کو بنیادی حیثیت دی۔ فرماتے ہیں:

"پہلے صرف و نحو میں تین چار رسالے پڑھائے جائیں۔ حدیث میں موطا امام مالک بروایت یحییٰ بن یحییٰ ضرور پڑھائی جائے۔ قرآن مجید کا رواں ترجمہ مکمل پڑھایا جائے۔"[14]

مزید لکھتے ہیں:

"اس سے قبل نصاب میں مشکوۃ المصابیح شامل تھی، اس کے بعد صحاح ستہ کو شامل کیا گیا، اس طرح درس نظامی کے ابتدائی نصاب میں منطق و فلسفہ کی بیس کے قریب کتابیں تھیں جو کم ہوتے ہوتے اب صرف تین چار رہ گئیں ہیں۔ اب درس نظامی میں چند کتب کے سوا بیشتر کتب زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ کتابوں کے مؤلفین سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔"[15]

برصغیر میں نظام تعلیم کے بڑے اصلاحی مراکز

ندوۃ العلما

ندوۃ العلما ۱۸۹۸ء میں قائم ہوا۔ علامہ شبلی ۱۹۰۶ء کو اس سے وابستہ ہوئے۔ ندوہ کے مقاصد میں نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی اور عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام شامل تھا۔ ندوۃ العلما کا قیام دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ دونوں کے نصاب کا بین بین تھا۔ خیال یہ تھا کہ ندوہ کے فضلا دیوبند کے علما کی نسبت معاشرتی طور پر زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوں اور علی گڑھ کے مقابلہ میں انکی دینی تربیت زیادہ ہو۔ ندوۃ العلما کا تاریخ، ادب اور دینی لٹریچر کی تیاری میں قابل رشک کام ہے۔ یہ ایک عظیم علمی تحریک تھی۔ ندوۃ العلما نے بڑی محنت کے بعد ایک نیا نصاب پیش کیا جس میں منطق، فلسفہ کو کم اہمیت دی گئی، تفسیر و حدیث کو مناسب مقام دیا گیا، جدید اسلوب کے

۱۳۔ خالد رحمن، پاکستان میں دینی تعلیم، منظر، پس منظر، وپیش منظر، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۱۴۔ حوالہ بالا

۱۵۔ رپورٹ قومی کمیٹی برائے دینی مدارس، ص ۶۱، وزارت مذہبی امور حکومت پاکستان، ۱۹۷۹ء

مطابق نئی کتب تحریر کرائی گئیں، عربی زبان اور جدید علوم کا خاصا اہتمام کیا گیا۔۱۸۹۸ء میں علمانے اصلاح شدہ اس نصاب کو قبول کیا اور قدیم نصاب میں قابل قدر اصلاح ہو گئی۔[16]

دار العلوم دیوبند کی اصلاحی کوششیں

اگرچہ دار العلوم کے قیام کے بعد بالعموم اصلاحی کوششوں کی شدید مزاحمت ہوئی تاہم دار العلوم کے منتظمین میں بھی یہ احساس پایا جاتا تھا کہ اصلاح کی ضرورت ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی فرماتے تھے:

> ''ہماری خواہش ہے کہ دیوبند کی تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبا جدید تعلیم بھی حاصل کریں اور اس طرح علوم حاضرہ سے واقفیت بھی ہو۔''[17]

''۱۹۰۶ء میں دیوبند کے صدر مدرس شیخ الہند محمود الحسن نے جمیعۃ الانصار قائم کی اور علی گڑھ سے یہ معاہدہ ہوا کہ انگریزی خواندہ طلبا دار العلوم دیوبند میں جا کر علوم اسلامیہ حاصل کریں، دار العلوم اس کا خاص انتظام کرے گا۔ اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبا کو خاص انتظام کے ساتھ انگریزی کی تعلیم دے گا جو دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ جائیں گے۔''[18]

اس سے ایک بات یہ بھی واضح ہو جاتی ہے کہ برطانوی عہد میں دیوبند کے طرز کے دینی تعلیمی ادارے اور علی گڑھ کی طرز کے جدید ادارے مقاصد کے اعتبار سے ایک دوسرے کے حریف نہیں تھے بلکہ آزاد تعلیم میں برطانوی اقتدار کی مداخلت کے خلاف تھے۔ بعد کے برسوں میں ان میں قربت کی تحریک بھی چل پڑی تھی۔

علی گڑھ کا دار العلوم دیوبند کی خدمات کو خراج تحسین

بظاہر یہ دونوں ایک دوسرے کے حریف نظر آتے ہیں لیکن جب کچھ اصلاحات اور قربت ہوئی تو ایک دوسرے کی خدمات کا اعتراف بھی کیا۔ سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ دار العلوم دیوبند کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''ٹوٹے سے ٹوٹے مدرسہ اور ان کے خستہ حال معلم ارتداد کے فتنے اور بے دینی کے سیلاب کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ یاد رکھیے ہم میں سے کوئی بھی کبھی ان کی دستگیری کے

۱۶۔ ڈاکٹر، محمد ابراہیم خالد، نصاب تعلیم، پاکستان ایجوکیشن فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۲۱۵

17۔ گیلانی، سید مناظر احسن، سوانح قاسمی، ص ۹۸، ۲۲۶

18۔ حوالہ بالا ۲۰۷۔ ۲۱۴

لیے آگے بڑھا؟ اس لیے ہمیں زیب نہیں دیتا کہ انہیں تحقیر سے دیکھیں یا اونچائی پر بیٹھ کر ان کی اصلاح و تجدید کا بیڑا اٹھائیں۔"[19]

پھر دینی مدارس میں تبدیلی کی ضرورت کا احساس بھی دلایا:

"دینی مدارس کی تعلیم مواد، موضوع اور طریقہ تدریس کے تعلق سے انقلاب انگیز اور عہد آفریں تبدیلیوں کی طالب ہے لیکن دینی تعلیم کے لیے ضروری وسائل فراہم کرنے ہوں گے۔ اگر ہم وسائل فراہم نہیں کر سکتے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔"[20]

مدرسۃ الاصلاح

ندوۃ العلما کی فکر سے ہم آہنگ مدرسۃ الاصلاح کا سنگ بنیاد ۱۹۰۹ء میں رکھا گیا۔ یہ درسگاہ سرائے میر مضافات اعظم گڑھ میں ایک چٹیل میدان میں قائم کی گئی۔ علامہ شبلی بھی بعد میں اس درس گاہ میں آ گئے تھے۔ اس مدرسہ کی صورت گری مولانا حمید الدین فراہی کے ہاتھوں ہوئی۔ آپ ہی نے مدرسہ کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار کا تعین کیا اور ابتدائی خاکہ مرتب کیا۔ اس ادارے کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ قرآن مجید کو علوم کا سرچشمہ قرار دے کر قدیم وجدید تمام علوم کو اس میں پڑھایا جاتا تھا۔ جدید و قدیم کا ایک اچھا توازن قائم کیا گیا۔ اس طرز کے اور بھی بہت سے ادارے بعد میں قائم ہوئے۔ جامعہ ملیہ، جامعہ عثمانیہ: ندوہ، مدرسۃ الاصلاح، کے پلیٹ فارم سے اسلامی نظام تعلیم کی اصلاح کی جزوی کوششیں ہوئی ہیں۔ ان سب اداروں کے مشترک نکات یہ تھے:

1. مسلمانوں کی دینی و فکری اصلاح
2. دینی و عصری علوم کا امتزاج
3. اسلامی تہذیب و تمدن کا تحفظ و احیا
4. الحاد و دہریت کا مقابلہ

ان تمام اصلاحات کے عمل میں سب سے توانا آواز ندوۃ العلما کے منتظمین اور وابستگان کی رہی ہے۔ انہیں دینی مدارس میں تبدیلی کا شدت سے احساس تھا۔ سید ابوالحسن علی ندوی دیوبند کے ایک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نہایت

[19]۔ برصغیر پاک و ہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے، خصوصی شمارہ مجلہ علم و آگہی، ص ۱۰۴۔۱۰۵

[20]۔ محمد ریاض درانی، اسلامی نظام تعلیم کے خد و خال، فاؤنڈیشن فار ایجوکیشن ڈویلپمنٹ، نئی دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۶، دارالعلوم دیوبند، ص ۸۱، مشتاق پرنٹنگ پریس، لاہور ۲۰۰۵ء

دلسوزی سے توجہ دلاتے ہیں: ''نصاب تو ہر پانچویں، دسویں سال بدلتے ہیں، یہ کیسے نصاب ہیں جنہیں صدیوں میں بھی بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔''

ندوۃالعلماہی کے ایک فاضل جناب نذر الحفیظ لکھتے ہیں:

> ''نصاب تعلیم کا تعلق ماحول اور حالات کے تقاضوں سے ہوتا ہے اور نصاب تعلیم کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ جو معاشرے کے چیلنج ہوتے ہیں، جو مشکلات ہوتی ہیں نصاب تعلیم ان کو حل کرتا ہے۔۔۔ایک نئی نسل ایسی نکل رہی ہے جو جدید تعلیم گاہوں سے آرہی ہے، جو نصاب وہ پڑھ رہی ہے اس نصاب نے ان کو دین کے قابل نہیں رکھا۔ ہم عربی مدارس کے ذمہ دار حضرات ان کی ضروریات سے آنکھیں نہیں بند کر سکتے یعنی سمندر میں جزیرے کا تصور ہوتا ہے لیکن خشکی میں جزیرے کا تصور نہیں کر سکتے۔''[21]

قیام پاکستان کے بعد کی اصلاحی کوششیں

حکومتی سطح پر اقدامات

آزادی کے بعد احساس یہ تھا کہ ہمارا نصاب تعلیم عہد جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، اس احساس کے تحت مختلف تعلیمی کمیشن بنے، تعلیمی کانفرنسیں ہوئیں، قومی تعلیمی پالیسیاں بنیں لیکن بدقسمتی سے کسی کو بھی عملی جامہ نہیں پہنایا جاسکا۔ پہلی تعلیمی کانفرنس ۱۹۴۷ء (۲۷ نومبر تا یکم دسمبر ۱۹۴۷ء) کو منعقد ہوئی جس میں نظام تعلیم کو اسلامی نظریہ حیات اور ریاستی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی سفارش کی گئی۔ لیکن یہ سرخ فیتے کی نذر ہو گئیں۔

۱۹۵۹ء میں قومی تعلیمی کمیشن (شریف کمیشن) نور خان تعلیمی رپورٹ، پیرزادہ تعلیمی رپورٹ، غلام مصطفی تعلیمی رپورٹ، دس سالہ قومی تعلیمی پالیسی، رپورٹ قومی کمیٹی برائے دینی مدارس وغیرہ۔ وقت گزرتا رہا اور یہ سفارشات محض سفارشات ہی رہیں۔ ان تمام رپورٹس میں قدر مشترک یہ ہے:

1. آزاد اور متوازی نظام کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی گئی۔
2. اعلیٰ طبقوں اور مخصوص مفادات کا تحفظ کرنے والی پالیسیاں بنائی گئیں۔
3. فکری ہم آہنگی کے بجائے طبقاتی نظام تعلیم اور سوچ کو فروغ دیا گیا۔ اور قوم کو مختلف دائروں میں تقسیم کر دیا گیا۔
4. بالعموم دینی مدارس کو نظر انداز کیا گیا۔

21۔ عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم، ص ۴۷

5. نظام تعلیم کو اسلامی نظریہ حیات کے مطابق ڈھالنے کی سفارشات کی گئیں لیکن اس کے بارے میں کوئی لائحہ عمل نہیں دیا گیا۔[22]

دینی مدارس کی سطح پر اقدامات

مولانا انور شاہ کشمیری جب ڈابھیل تشریف لے گئے تو انہوں نے جو نصاب بنایا تھا اس میں شرح جامی کی جگہ شرح ابن عقیل، شرح وقایا کی جگہ شرح وقایہ، اصول الشاشی کی جگہ تعقید النظر رکھی اور اس کے علاوہ بھی بہت سی تبدیلیاں کیں۔ اس بات کا اعتراف مولانا انظر شاہ کشمیری نے کیا ہے۔[23]

مولانا انظر شاہ نے مولانا اشرف علی تھانوی کی نصابی تبدیلیوں کا بھی ذکر کیا ہے کہ مولانا نے فرمایا:

> "ایک ہے واقفیت اور ایک ہے کمال۔ کمال تو ہونا چاہیے دینی علوم اور دینی مقاصد کے لیے، جہاں تک واقفیت کا معاملہ ہے تو واقفیت کے بہر حال ہم محتاج ہیں۔"[24]

اس موقع پر مولانا انظر شاہ نے یہ تجویز بھی دی ہے کہ اگر اسے "نصاب میں تبدیلی" کا عنوان دینے کے بجائے "نصاب علوم جدیدہ" کا عنوان دیا جائے تو بہت جلد اسے قبول کر لیا جائے گا۔[25]

دینی مدارس میں اصلاحات کا دائرہ کار

دینی مدارس اپنے تئیں اصلاحات کی ضرورت محسوس کرتے رہے ہیں اور انہوں نے کس قسم کی اصلاحات کی ہیں۔

اصلاحات کے حوالے سے دینی حلقوں میں دو نقطۂ ہائے نظر رہے ہیں:

1. ہمہ گیر اصلاح
2. جزوی اصلاح

1. **ہمہ گیر اصلاح:** بعض دینی حلقوں کا مؤقف یہ ہے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم میں جزوی پیوند کاری کافی نہیں بلکہ ہمہ گیر اور انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ صرف اسی صورت میں یہ نظام تعلیم مسلمان معاشرے کی

22۔ حوالہ بالا

23۔ پروفیسر، سید محمد سلیم، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ص ۲۹۴۔۲۹۵

24۔ اسلامی نظام تعلیم کے خدوخال، ص ۳۱

25۔ عربی اسلام مدارس، ص ۳۷

تشکیل میں اپنا کردار بھی ادا کر سکتا ہے اور اسلامی ریاست کے لیے مطلوب رجال کار بھی مہیا کر سکتا ہے۔ محض انگریزی یا سائنس پڑھانے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا یہ غلط فہمی ہے۔اس کے لیے تمام علوم کی نئی ترتیب و تبویب اور جدید تالیف کی ضرورت ہے۔اس نقطۂ نظر کے سب سے بڑے علمبردار سید ابوالاعلی مودودیؒ ہے۔ انہوں نے تعلیم کی ثنویت کو مٹا کر اسلامی ریاست کو مطلوب رجال کار کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسلامی نظام تعلیم کا خاکہ دیا ہے۔[26]

2. **جزوی اصلاح:** قیام پاکستان سے پہلے ندوۃ العلما، مدرسۃ الاصلاح، جامعہ ملیہ اور جامعہ عثمانیہ جزوی اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں وجود میں آئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اس نوع کی بے شمار کوششیں ہو چکی ہیں جنکی جدید ترین شکل مختلف وفاق (وفاق المدارس العربیہ، تنظیم المدارس، وفاق المدارس السلفیہ، رابطۃ المدارس الاسلامیہ، وفاق المدارس شیعہ) اور ان کی نمائندہ تنظیم اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ ہے۔

دینی مدارس سے وابستہ علما کے دینی مدارس پر اعتراضات / قابل اصلاح پہلو

دینی مدارس کے پالیسی سازوں کی طرف سے درج ذیل قابل اصلاح پہلوؤں کی وقتاً فوقتاً نشان دہی کی جاتی رہی ہے۔ معروف عالم دین مولانا زاہد الراشدی درج ذیل قابل اصلاح پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہیں:

أ. زبانوں کا مسئلہ دینی مدارس میں سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے عربی زبان بھی صرف کتاب فہمی تک محدود ہے۔ عربی میں گفتگو، خطاب یا مضمون نویسی کی صلاحیت سے دینی مدارس کے فضلا محروم ہیں جب کہ اردو میں بھی دو تین صفحات کا مختصر مضمون لکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

ب. انسانی سوسائٹی کا معاشرتی ارتقا، تاریخ، نفسیات، تعلقات عامہ، سیاسیات، معاشیات، تہذیب و ثقافت اور دیگر عمرانی علوم نہ صرف دینی مدارس کی تدریس، تحقیق، اور مطالعہ سے خارج ہیں بلکہ ان کی اہمیت کا احساس بھی نہیں۔

ت. دینی مدارس میں لائبریریوں کا نظام ناگفتہ بہ ہے۔چند بڑے مدارس کے علاوہ اکثر مدارس میں یہ سہولت موجود نہیں، اگر موجود ہو تو اساتذہ کی رسائی نہیں ہے۔

ث. تحقیق و تالیف کا کوئی ادارہ جاتی نظام نہیں بلکہ شخصی ذوق پر منحصر ہے۔

ج. اجتماعی اور قومی مسائل پر بھی ملکی دائروں میں بند رہتے ہیں، باہمی مشاورت کا کوئی اہتمام نہیں۔

26۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: قومی تعلیمی پالیسیاں، تقابلی جائزہ، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز، اسلام آباد ۱۹۹۶ء

ح. علمی حلقوں کی تحقیقات اور دوسرے مسالک کے علمی کام کو اپنی نفسیاتی برتری کے خلاف تصور کرتے ہیں اور اس سے بُعد اور فاصلے بڑھتے ہیں۔

خ. تحقیق و مطالعہ کا جدید اسلوب اب بھی دینی مدارس میں شجر ممنوعہ ہے۔

د. فقہی اور مسلکی مباحث میں باہمی مناظرہ و مباحثہ کے حوالے سے افہام و تفہیم، تطبیق و مفاہمت کے بجائے ایک دوسرے پر برتری کا ذوق غالب ہے اور اس کے لیے بسا اوقات طعن و تشنیع سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

ذ. تحقیق و مطالعہ کے حوالے سے مسلکی وابستگی اور شخصی عقیدت کو ترجیحات میں فیصلہ کن اولیت حاصل ہے۔[27]

کم و بیش یہی اعتراضات یا تحفظات مدارس سے وابستہ دیگر علما کے بھی ہیں۔ یہ بطور نمونہ پیش کیے گیے ہیں۔

ر. دینی مدارس۔۔۔ تبدیلی اور اصلاح کے رجحانات

ز. دینی مدارس میں تبدیلی و اصلاح کے ضمن میں اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ ان کا قیام معاشرے کی بعض اہم اور بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لایا جاتا ہے۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ خاندانی، معاشی، سیاسی اور سماجی زندگی میں بے شمار نئے پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے ہیں، لوگ راہنمائی کے حصول کے لیے دینی مدارس کے فضلا کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس نوع کے کچھ داخلی عوامل ہیں جنہوں نے مدارس میں اصلاح اور تبدیلی کا احساس پیدا کیا ہے اور اس حوالے سے جو تبدیلیاں عملاً آرہی ہیں ان کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

س. خواتین کی تعلیم کا آغاز اس وقت کم و بیش ۱۵۰ ادارے طالبات کے ہیں، بعض میں فنی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔

ش. بعض عصری مضامین کا اجرا

ص. آن لائن فتاویٰ

ض. تخصص کے پروگرام

ط. طلبا کے لیے آڈیو وڈیو پروگرام

ظ. انفرمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال

ع. اسلامی بینکاری، صحافت، ایم بی اے، قانون، تقابل ادیان، انگریزی زبان

غ. کمپیوٹر کے کورسز کا انعقاد

ف. سالانہ تفریحی دورے

27۔ عربی اسلامی مدارس، ص ۳۵۔۳۶

ق. نمائش کتب

ک. اصلاحات کے حوالہ سے کراچی کے بعض بڑے مدارس مثلاً دارالعلوم کراچی، جامعۃ الرشید، اشرف المدارس، جامعہ بنوریہ، جامعہ ابوبکر، جامعہ عثمانیہ پشاور قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں۔[28]

جدید طرق تدریس

1. نوجوان اساتذہ میں جدید طرق تدریس کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے مثلاً ملٹی میڈیا کا استعمال شروع ہوا۔
2. بچوں کی جسمانی سزا میں کمی کا رجحان ہے۔
3. مالی لحاظ سے بہتر گھرانوں کے طلبا کے لیے بہتر ماحول اور سہولیات کی فراہمی کا انتظام مثلاً ایئر کنڈیشنڈ کلاس روم، بہترین فرنیچر اور دیگر سہولیات۔
4. بعض دینی مدارس میں دینی علوم کے ساتھ ایم فل، پی ایچ ڈی اساتذہ بھی ہیں، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔
5. تربیت اساتذہ کے لیے کورسز کا آغاز: ۲۰۰۸ء میں اس قسم کا ایک کورس جامعہ عثمانیہ پشاور میں ہوا۔
6. میٹرک تک کے مضامین مدارس نے نصاب میں شامل کر لیے ہیں۔
7. بعض مدارس مثلاً جامعہ نعیمیہ لاہور، اور کراچی کے بڑے مدارس میں ایف اے، بی اے کی باقاعدہ کلاسیں ہوتی ہیں۔
8. بڑے مدارس میں "Lang. Lab" کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جو کسی بھی یونیورسٹی کی Lab سے کم نہیں ہے۔
9. تفریحی پروگرام: والی بال، کرکٹ، فٹ بال کے ساتھ بعض مدارس میں سوئمنگ پول بھی ہیں۔
10. اگرچہ تبدیلی کا یہ عمل سست ہے لیکن پھر بھی ایک مثبت پیش رفت ہے۔[29]

اعتراضات پر ایک ناقدانہ نظر

اً. میڈیا گزشتہ دس پندرہ سال سے دینی مدارس کی بڑی تاریک تصویر پیش کر رہا ہے جو گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد تاریک سے تاریک تر ہو گئی ہے۔

ب. میڈیا جو باور کراتا ہے وہ یہ ہے کہ مدرسہ تنگ و تاریک کوٹھڑی کا نام ہے جہاں بچے زنجیروں میں بندھے ہوتے ہیں، مولوی صاحب کے ہاتھوں میں ڈنڈا ہے اور مسلسل مار رہا ہے۔

28۔ حوالہ بالا

29۔ حوالہ بالا

ت. یہ تاثر بڑی حد تک مدارس کے نظام سے بے خبری اور جہالت کا نتیجہ ہے۔اس طرح کے تبصرے کرنے والے حضرات کو ممکن ہے زندگی میں ایک مرتبہ کسی مدرسہ کو دیکھنے کا موقع نہ ملا ہو۔یہ طبقہ اپنی معلومات کی اصلاح کی کوشش بھی نہیں کرتا۔اگر انہیں قریب سے گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کا موقع مل جائے تو اصل حقائق سامنے آسکتے ہیں۔

ث. مزید یہ کہ کسی ایک مدرسہ کے خاص واقعہ کو بنیاد بنا کر تمام مدارس کی کردار کشی کرنا اور ان کا امیج خراب کرنا ہر گز معقولیت نہیں ہے،جب کہ دور استعمار اور تحریک آزادی میں دینی علوم واقدار کے تحفظ اور علمی روایات کو باقی رکھنے میں دینی تعلیمی اداروں نے غیر معمولی خدمات سرانجام دی ہیں۔

ج. درحقیقت آج پورے نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے دینی علمی حلقوں میں بالعموم یہ احساس پایا جاتا ہے کہ دینی مدارس اپنی آزادی پر سمجھوتہ کیے بغیر مثبت تبدیلیاں کریں تاکہ دینی تعلیم کے یہ مراکز دوبارہ وہ منصبی کردار ادا کریں جس کے وہ ذمہ دار اور مستحق ہیں۔اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ بڑے مدارس تبدیلیوں کے حوالہ سے قائدانہ کردار ادا کر رہے ہیں جن کا ذکر تفصیل سے ہوا ہے۔

ایک حد تک یہ تبدیلیاں مثبت پیش رفت ہیں لیکن تبدیلی کی رفتار سست ہے جس تیزی کے ساتھ حالات تبدیل ہو رہے ہیں مدارس ان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں،اسی لیے ہر سطح پر تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔

مدارس اس وقت کہاں کھڑے ہیں؟اس کے لیے جامعہ عثمانیہ پشاور کے مہتمم مفتی غلام الرحمان کا یہ اقتباس خلاصہ کلام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے:

> ”دینی مدارس کی اس میدان میں کارکردگی مایوس کن ہے۔ہم سب کے ارادے آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔بدقسمتی سے ہم نعروں کے میدان میں گرے رہتے ہیں لیکن عملی میدان کی خبر نہیں لیتے۔یہ ایک ناقابل انکار حقیقت کہ دنیا کے تقاضے مختلف ہیں۔ان کے ادراک کے بغیر میدان عمل میں متحرک رہنا مشکل ہے۔اس لیے ہمارے تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نونہال طلبا کی تربیت میں عصری مشکلات کا ادراک کریں۔“[30]

یہ اس احساس کا اظہار ہے کہ مدارس کی بقا کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خود اپنی سطح پر اپنے آپ کو عصری حالات اور ضروریات کے نقطۂ نظر سے تیار کریں۔اس کے بغیر ان کی بقا ممکن نہیں۔

30۔ دینی مدارس، تبدیلی کے رجحانات، ص۲۹۔۴۰